انٹرنیٹ پر قرآنی قصص میں تضادات کے اعتراضات

(بنی اسرائیل کے حوالہ سے خصوصی مطالعہ)

منزہ حیات اعوان*

Abstract:

Internet plays an important role in gloibalization and a sitaution has been thus created on account of in which dialogues across distances become possible. Hence many Western scholars have started finding 'contradictions' in the Holy Quran which are normally the result of limited knowledge of Arabic and the linguistic style of the holy book. In fact a particular website created for this purpose, and several articles can be found on this theme. In the present article, reasons for confusion in the understanding of the Quranivc verses are analysed in detail

قرآن حکیم محض ایک مذہبی کتاب نہیں جو اپنے ماننے والوں سے اندھی عقیدت مطالبہ کرتی ہو بلکہ وہ کتابِ شعور ہے جو نہ صرف گرد و پیش کے بارے میں دعوت غور و فکر دیتی ہے بلکہ اپنی بابت بھی سوچنے پر ابھارتی ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

افلا یتدبرون القرآن ولو کان من عند غیرالله لوجدوافیه اختلافا کثیرا۔ (النساء۔۸۲)

''کیا یہ لوگ قرآن کے بارے میں غور و فکر نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلاف (تضاد) پاتے''۔

یقیناً قرآن پر غور و فکر کے لئے اس کی زبان کے اسلوب سے واقفیت ضروری ہے، نیز قرآن کے انداز بیان پر گہری نظر درکار ہے مگر معترضین نے اس سے آگہی کے بغیر (جو طے شدہ اصول تحقیق کے منافی ہے) قرآن کو اعتراضات کا ہدف بنایا جو تاریخ میں مستشرقین کے عنوان سے پہچانے جاتے ہیں۔

* ریسرچ سکالر، شعبہ علوم اسلامیہ، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔

یہ بات ایک تلخ حقیقت کے طور پر سامنے آ چکی ہے کہ جب سے اسلام نے حجاز میں جنم لیا، عیسائی اور یہودی دنیا اس کے خلاف سر جوڑ کر اکٹھی ہوگئی۔ برنارڈ لوئیس جو کہ موجودہ دور کا سب سے بڑا امریکی مستشرق ہے اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''دونوں (اسلام بمقابلہ یہودیت وعیسائیت) نظاموں کے درمیان ایک معاندانہ مخاصمت چودہ سو سالوں سے شروع ہے اور یہ سلسلہ تا ہنوز جاری وساری ہے''۔(۱) یہ معاندانہ مخاصمت جہاں حربی، سیاسی، معاشی اور دیگر میدانوں میں نمایاں رہی وہاں اس نے علمی دنیا کو بھی متاثر کیا۔ چنانچہ مغرب میں تحریک استشراق نے جنم لیا۔

استشراق کیا ہے:

استشراق کی جو تعریف عام طور پر مشہور ہے:

''غیر مشرقی لوگوں کا مشرقی زبانوں، تہذیب، فلسفے، ادب اور مذہب کے مطالعے میں مشغول ہونے کا نام ہے''۔ (۲)

اس تعریف کی رو سے جو غیر مشرقی عالم، مشرقی علوم کے لئے اپنے آپ کو وقف کرے گا اسے مستشرق کہا جائے گا۔

آربری کہتا ہے کہ "Orientalist" کا لفظ پہلی مرتبہ ۱۶۳۰ء میں مشرقی یا یونانی کلیسا کے ایک پادری کے لئے استعمال ہوا تھا۔ (۳)

روڈنسن (Rodinson) کہتا ہے کہ "Orientalism" یعنی استشراق کا لفظ انگریزی زبان میں ۱۷۷۹ء میں داخل ہوا جبکہ فرانس کی کلاسیکی لغت میں استشراق کے لفظ کا اندراج ۱۸۳۸ء میں ہوا۔ حالانکہ عملی طور پر تحریکِ استشراق اس سے کئی صدیاں پہلے وجود میں آ چکی تھی اور پورے زور وشور سے مصروفِ عمل تھی۔(۴)

مستشرقین اور استشراق کی صحیح تعریف کرنے کے لئے لفظ ''مشرق'' کا مفہوم بڑا معاون ثابت ہوسکتا ہے کہ مستشرقین کے عرف میں لفظ مشرق کا جغرافیائی مفہوم مراد نہیں بلکہ ان کے ہاں مشرق سے مراد وہ خطے ہیں جہاں اسلام کو فروغ حاصل ہوا۔

مشرق کے اس مفہوم کے تحت، مستشرقین کی عملی جدوجہد جن خفیہ مقاصد کی غمازی کرتی ہے اور جن کا اظہار کبھی کبھی بعض مستشرقین کی طرف سے ہوتا بھی رہتا ہے ان کو اور مستشرقین کے بے شمار علمی کارناموں اور ان کے

مختلف طبقات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے معروف سکالر پیر کرم شاہ الازہری لکھتے ہیں۔

> اہلِ مغرب بالعموم اور یہود و نصاریٰ بالخصوص، جو مشرقی اقوام خصوصاً ملتِ اسلامیہ کے مذاہب، زبانوں، تہذیب وتمدن، تاریخ، ادب، انسانی قدروں، ملّی خصوصیات، وسائلِ حیات اور امکانات کا مطالعہ معروضی تحقیق کے لبادے میں اس غرض سے کرتے ہیں کہ ان اقوام کو اپنا ذہنی غلام بنا کر ان پر اپنا مذہب اور اپنی تہذیب مسلّط کر سکیں، ان کو مستشرقین کہا جاتا ہے۔ اور جس تحریک سے وہ لوگ منسلک ہیں وہ تحریک استشراق کہلاتی ہے۔ (۵)

تحریک استشراق کی تاریخ کو سمجھنے کے لئے اسے مختلف ادوار میں تقسیم کرنا ضروری ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنے ایک مقالے مستشرقین کے افکار ونظریات کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے:

پہلے دور کا تعلق اس زمانے سے ہے جب مسلمانوں نے اندلس کو علم وحکمت اور تہذیب وتمدن کا مرکز بنایا اور اہلِ مغرب اس شمع علم سے اکتسابِ نور کرنے یا اس شمع کو بجھانے کے لئے جوق در جوق اندلس کا رخ کر رہے تھے۔

دوسرے دور کا تعلق اس زمانے سے ہے جب صلیبی جنگوں میں پے در پے شکستوں نے دنیائے نصرانیت کو اسلام دشمنی میں پاگل پن کی حد تک پہنچا دیا تھا اور وہ اسلام اور پیغمبر ﷺ کے خلاف نت نئے انداز میں زہر اگل رہے تھے۔

تیسرے دور کا تعلق اس زمانے سے ہے جب مغرب مضبوط اور عالمِ اسلام کمزور ہو چکا تھا اور مغربی طاقتیں استعماری اور استبدادی عزائم کے ساتھ مشرق کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

چوتھے دور کا تعلق اس زمانے کے ساتھ ہے جب نوآبادیات کے باشندے غیر ملکی تسلط کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے استعماری طاقتوں کو اپنے اپنے ممالک سے نکالنے کی جدوجہد شروع کر دی تھی۔

پانچویں دور کا تعلق اس زمانے سے ہے جب قدرت نے عالمِ اسلام کو زرسیال کی دولت سے مالا مال کیا اور اہلِ مغرب کی حریص نگاہیں اس دولتِ خداداد پر مرکوز ہو گئیں۔ (۶)

اس دور کا تعلق اس زمانے سے ہے جب عالمِ اسلام میں اسلامی تحریکوں نے زور پکڑا اور انہوں نے عالمِ اسلام کو مغرب کی ذہنی غلامی سے نجات دلانے اور فرزندانِ توحید کو اپنے سارے مسائل کے حل کے لئے واشنگٹن اور ماسکو کی بجائے مکہ اور مدینہ کی طرف توجہ مبذول کرنے کی تلقین کی۔ (۷)

گواس دور کو پیر کرم شاہ الازہری کو تحریک استشراق کا چھٹا دور قرار دیتے ہیں مگر ہماری رائے میں یہ جدید نو آبادیاتی دور ہے کہ جس میں مختلف ممالک جغرافیائی طور پر تو آزاد ہوئے مگر ایک عالمی نظام کے اسیر ہو کر رہ گئے۔

تاہم گلوبلائزیشن یا عالمگیریت کے دور نے تحریکِ استشراق پر بھی اثرات مرتب کئے یوں ہم موجودہ دور کو اس کا چھٹا دور قرار دے سکتے ہیں کہ مستشرقین نے اپنے نظریات کے پرچار کے لئے اب انٹرنیٹ کو بھی ذریعہ بنالیا ہے۔ پیغمبر اعظم ﷺ اور ان پر نازل کردہ کتاب قرآن مجید پر نت نئے طریقوں سے اعتراضات کئے جارہے ہیں تاکہ مخاطبین کے ذہنوں میں علمی اشکالات کی فصل اگائی جاسکے۔

تحریکِ استشراق کی تاریخ کے ان ادوار کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مستشرقین نے اپنے کام کا آغاز دو جہتوں میں کیا تھا۔ انہوں نے ایک طرف تو مسلمانوں کے علمی ذخائر کو اپنے ممالک میں منتقل کرنے اور انہیں استعمال میں لاکر مادی اور تہذیبی میدانوں میں ترقی کرنے کی کوششیں شروع کیں اور دوسری طرف مسلمانوں کے دین، ان کی تاریخ اور ان کی تہذیب کو دھندلانے، مسلمانوں کو اپنے دین سے غیر متعلق اور بیگانہ کرنے اور غیر مسلم لوگوں کو اس دین سے بیزار کرنے کی بھرپور مہم چلائی۔

زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ ان کے طریقۂ کار میں تو تبدیلیاں آتی رہیں لیکن جس مقصد کے تحت اس تحریک کا آغاز ہوا تھا وہ مقصد مستشرقین کی آنکھوں سے کبھی اوجھل نہیں ہوا۔ مستشرقین نے کبھی طالب علموں کا روپ اختیار کیا، کبھی تحقیق اور جستجو کے نام پر ممالکِ اسلامیہ کے کونے کونے تک جا پہنچے، کبھی مسلمانوں کے ہمدرد اور خیر خواہ بن کر منظرِ عام پر آئے اور کبھی پسماندہ اقوام کے لئے مشفق و مربی کا روپ دھارا۔ لیکن اتنے روپ بدلنے کے باوجود ان کا مقصد ہمیشہ ایک ہی رہا اور وہ مقصد اسلام کی مخالفت کرنا اور دنیا میں اس دینِ متین کی اشاعت کو روکنا ہے۔

مستشرقین کی اکثریت کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ اسلام کے شجرۂ طیبہ کی بیخ کنی کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کی اصلِ اول قرآنِ کریم کو ہدف بنایا جائے۔ انہیں معلوم تھا کہ جب تک قرآن حکیم موجود رہے گا تب تک مسلمانوں کو یہ یقین رہے گا کہ اسی کتاب کی پیروی میں ان کی دنیا و آخرت کی کامیابی کی ضمانت موجود ہے، اور اس وقت تک اسلام کو نقصان پہنچایا جاسکتا ہے اور نہ ہی ملتِ اسلامیہ کو قوت اور شان و شوکت سے محروم کیا جاسکتا ہے۔

قرآنِ حکیم کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے انہوں نے مختلف زاویوں سے اس کتابِ مبین پر وار کئے۔ انہوں نے یک زبان ہو کر اعلان کیا کہ قرآن خدا کا کلام نہیں ہے بلکہ یہ حضرت محمد ﷺ کی اپنی تصنیف ہے۔ انہوں نے

قرآنِ حکیم کی تدوین اور حفاظت پر اعتراض کر کے اس کے ایک مستند دستاویز ہونے کا بھی انکار کیا۔ انہوں نے قرآنِ کریم کی فصاحت و بلاغت اور اس کی شانِ اعجاز پر بھی طبع آزمائی کی۔ انہوں نے اس کے مضامین، اس کی ترتیب اور اس کے اسلوب کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایا، قرآن حکیم کی تعلیمات بھی مستشرقین کے طعن و تشنیع کے تیروں سے محفوظ نہ رہ سکیں۔

اسلام، محمد ﷺ اور قرآن کریم پر جو اعتراضات کا سلسلہ جاری تھا اس دائرہ کار کو انٹرنیٹ کے ذریعے وسیع کر دیا گیا ہے۔ اعتراضات کی ایک طویل فہرست میں سے تین کا جواب اس مقالہ میں پیش کیا جا رہا ہے۔ انشاء اللہ باقی سوالات کے جوابات بھی اسی طرح دیے جائیں گے۔ ان سوالات کو درج ذیل سائٹ سے لیا گیا ہے۔

www.Answering Islam/quran/contra

OBJECTION NO. 1 (16):

The event of worship of the golden calf

1. Does Aaron share in Israelities's guilt?
   a. No (20:85 - 90)
   b. Yes (20:92 & &:15)
2. The Israelities repented about worshipping the golden calf BEFORE Moses returned from the mountain (7:149), Yet, they refused to repent but rather continued to worship the calf until Moses came back (20:91).

OBJECTION NO. 2 (17):

Was Jonah Cast on the desert shore or was he not?

"Then we cast him on the desert shore while He was sick" (37:145). "Had not graced from his Lord reached him, he would indeed has been cast off on the naked shore while he was reprobate" (68:49).

OBJECTION NO. 3 (18):

Moses and the Injil

Jesus is born more than 1,000 years after Moses, but in 7:157 Allah speaks to Moses about what is written in the Injil (the book given to Jesus).

معترض کا سوال نمبر 1:

اعتراض یہ ہے کہ کیا حضرت ہارون بنی اسرائیل کے فعلِ شرک جو بچھڑے کی پوجا اختیار کرنے کی صورت میں تھا، میں شامل اور شریک تھے یا نہیں۔

معترض اس اعتراض کی تفصیل میں جاتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ ؑ کو بتایا:

فانا قد فتنّا قومك من بعدك و اضلهم السامری (طٰہٰ:۸۵)

''بے شک ہم نے تیری قوم کا تیرے بعد امتحان لیا اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا''۔

اس آیت میں اللہ نے حضرت ہارون ؑ کو ہرگز کوئی الزام نہیں دیا بلکہ قرآن حکیم میں ذکر ہے کہ حضرت ہارونؑ نے اپنی قوم کو آزمائش میں مبتلا ہونے کی اطلاع دے کر اپنی پیروی کا حکم دیا۔

ولقد قال لهم هارون من قبل یقوم انّما فتنتم به ان ربکم الرحمن فاتبعونی واطیعوا امری۔ (طٰہٰ:۹۰)

''اور یقیناً ہارون نے اس سے پہلے کہہ رکھا تھا کہ اے میری قوم ماسوا اس کے نہیں کہ اس (بچھڑے) کے ذریعہ تمہاری آزمائش کی گئی ہے۔ اور یقیناً تمہارا پروردگار رحمٰن ہے پس تم میری پیروی کرو اور میرے حکم کی اطاعت کرو''۔

باوجود اس کے کہ حضرت موسیٰؑ اس بات کو جانتے تھے کہ سامری اور اس کی قوم بچھڑے کی پرستش میں شریک ہے اور حضرت ہارونؑ کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ انہوں نے حضرت ہارون ؑ کو قصوروار کیوں ٹھہرایا؟

قال یا هارون ما منعك اذ رایتهم ضلوا الا تتبعن افعصیت امری۔ (طٰہٰ:۹۲)

نیز اپنے بھائی کے سر کے بال کیوں پکڑ کر کھینچے

واخذ براس اخیه یجره الیه (الاعراف:۱۵۰)

معترض کے نزدیک درج بالا آیات آپس میں متضاد ہیں۔

معترض کے نزدیک حضرت ہارون اپنی قوم کے گناہوں کے ذمہ دار تھے کیونکہ حضرت موسیٰؑ نے اللہ سے ان کی مغفرت کے لئے دعا کی تھی:

قال رب اغفرلی ولا خی وادخلنا فی رحمتك و انت ارحم الراحمین

(الاعراف:۱۵۷)

مزید برآں معترض کے نزدیک حضرت ہارون نے بت پرستی کو تسلیم کیا اس اعتراض کے ثبوت کے لئے معترض نے آیت (الاعراف:۱۵۰) پیش کی ہے:

قال ابن ام ان القوم استضعفونی و کادوا یقتلوننی فلا تشمت بی الاعدآء ولا تجعلنی مع القوم الظالمین o

جوابی تفصیل:

معترض نے حضرت موسیٰؑ کے ان جملوں سے کہ:

اذ رایتھم ضلوا اور **الا تتّبعن** سے یہ نتیجہ نکالا کہ حضرت موسیٰؑ نے چونکہ حضرت ہارونؑ کو یہ جملے کہے تو خواہ مخواہ نہیں کہے بلکہ ان کے شرک کی وجہ سے ان کو یہ سب کچھ کہا۔ حالانکہ یہ بات درست نہیں ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی طبیعت میں جلال تھا اور وہ کسی کو حق کی خلاف ورزی کرتے دیکھ کر فوری اقدام فرماتے تھے جیسا کہ انہوں نے مصر میں ایک آدمی کو تھپڑ مار ڈالا کیونکہ وہ دوسرے آدمی پر ظلم کر رہا تھا (القصص:۱۵) جبکہ ویسا جلال حضرت ہارونؑ میں نہیں تھا۔ حضرت ہارونؑ نے بنی اسرائیل کو سمجھانے کی پوری کوشش کی اور اس میں کمی نہیں کی جیسا کہ سورۃ طٰہٰ کی آیت ۹۰ اس بات کی وضاحت کرتی ہے۔

وان ربکم الرحمٰن فاتبعونی واطیعوا امری o

حضرت موسیٰؑ حضرت ہارونؑ سے اگر ناراض ہوئے تو صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے بالکل حضرت موسیٰؑ کا طریقہ کار مکمل طور پر کیوں نہیں اپنایا۔

حضرت ہارونؑ نے جو جواب حضرت موسیٰؑ کو دیا اس میں آپ نے فرمایا کہ میں نے آپ کے حکم کی اطاعت کی مگر بنی اسرائیل پر شدت کا رویہ اختیار نہیں کیا مبادا آپ کی طرف سے یہ کہا جائے کہ میں نے اپنی سختی سے کام بگاڑ دیا اور قوم میں اختلاف ڈال دیا (گویا حضرت موسیٰؑ کہہ کر گئے تھے کہ بنی اسرائیل کو ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دینا اور ان میں حسبِ امکان اتحاد قائم رکھنا)۔(۸)

معترض نے اعتراض کرتے ہوئے سورہ اعراف کی آیت ۱۵۱ پیش کی ہے جس کے مطابق حضرت موسیٰؑ نے حضرت ہارونؑ کے لئے بخشش کی دعا کیوں کی اگر وہ قصوروار نہیں تھے حالانکہ اگر دیکھا جائے تو حضرت موسیٰؑ

یہاں پر اپنے لئے بھی دعا "رب اغفرلی" کررہے ہیں حالانکہ وہ خود کسی صورت قصوروار نہ تھے یہ دعا صرف اس وجہ سے کی جارہی ہے جب حضرت ہارونؑ نے اپنی صفائی پیش کردی اور حضرت موسیٰؑ کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا تو احساس ہوا کہ جوش غضب میں ردعمل شدید ہوگیا پس اپنے لیے رب کی رحمت اور مغفرت کی طرف متوجہ ہوئے اسی طرح اپنے بھائی کے لیے مغفرت طلب کی کہ ممکن ہے کہ ان سے بھی کوئی اس عرصہ میں کمی بیشی ہوگئی ہو۔

جیسا کہ تفسیر کشاف میں ہے:

(اغفرلی ولا خی) الآیة ۔ استغفر لنفسه مما فرط منه الی اخیه، ولا خیه مما عسیٰ ان یکون فرط منه فی حین لخلافه، وطلب الا یتفرقا عن رحمته، ولا تزال منتظمه بهما فی الدنیا والآخره (۹)

جہاں تک بنی اسرائیل کے جرم میں شرکت یعنی بت پرستی یا بت بنانے کا الزام حضرت ہارونؑ کی نسبت بیان کیا گیا ہے قطعی غلط اور بے بنیاد ہے۔ کیونکہ جو آیت اس کلام میں بطور ثبوت پیش ہے اس میں نہ تو بت پرستی کا ذکر ہے اور نہ ہی بت بنانے کا۔ ان تمام باتوں کی وضاحت کے بعد یہی کہا جا سکتا ہے، کہ یہ تضاد کم فہمی کی بنیاد پر ہوا اور ویسے بھی یہ حقیقت ہے کہ نہ صرف حضرت ہارون بلکہ تمام انبیاء ورسل ہر قسم کے گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں وہ دنیا سے کفر وشرک کی جڑوں کو تقویت پہنچانے کے لئے نہیں بلکہ ان کو کاٹنے کے لئے آتے ہیں۔

ii۔ اس اعتراض میں جس دوسری بات کو تضاد بنا کر پیش کیا گیا وہ یہ ہے کہ سورۃ الاعراف کے مطابق اسرائیلیوں کو بچھڑنے کی پرستش کا شرک ہونا معلوم ہوگیا تھا اور انہوں نے حضرت موسیٰؑ کے کوہ طور سے واپس آجانے سے قبل اللہ سے مغفرت طلب کرلی اور اپنے جرم سے تائب ہو چکے تھے۔

جبکہ سورۃ طٰہٰ کے مطابق ایسا نہیں ہوا انہوں نے اپنے جرم کی معافی اس وقت مانگی جب حضرت موسیٰؑ واپس آگئے اور ان پر غصہ کیا اور انہیں یہ احساس دلایا کہ انہوں نے شرک عظیم جیسے گناہ کا ارتکاب کیا ہے تب کہیں جا کر انہوں نے توبہ کی۔

اس واقعہ کی اصل صورت حال کو سمجھنے کے ئے ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کریں تو ہمیں درج ذیل آیات ملتی ہیں۔ سورۃ الاعراف کی وہ آیات درج ذیل ہیں جس میں مستشرقین کے مطابق حضرت موسیٰؑ کی کوہ طور سے واپسی سے قبل اسرائیلی اپنے کئے پر پچھتائے۔

ولـمـا سقط فی ایدیھم وراوا انھم قد ضلوا قالو لئن لم یرحمنا ربنا و یـغفرلنا لنکونن من الخٰسرین ○ ولـما رجع موسیٰ الٰی قومه غضبان اسفا قال بئسما خلفتمونی من بعدی ..... (الاعراف۱۵۰۔۱۴۹)

''اور جب وہ سخت پشیمان ہوئے اور انہیں نظر آ گیا کہ وہ (راہ راست سے) بھٹک گئے (تو) کہنے لگے کہ اگر نہ رحم فرماتا ہم پر ہمارا رب اور نہ بخش دیتا ہمیں تو ہم ضرور ہو جاتے نقصان اٹھانے والوں سے۔اور جب واپس آئے موسیٰ ؑ اپنی قوم کی طرف خشمناک (اور) غمگین ہو کر (تو) بولے (اے قوم!) بہت بری جانشینی کی ہے تم نے میری میرے بعد.....

سورۃ طٰہٰ کی وہ آیت جس سے تضاد بنانے کی کوشش کی گئی:

قالوا لن نبرح علیه عٰکفین حتیٰ یرجع الینا موسیٰ (طٰہٰ:۹۱)

سورۃ الاعراف میں بنی اسرائیل کی جو شرمندگی بیان کی گئی ہے وہ حضرت موسیٰ ؑ کے ان کی طرف واپس آ جانے کے بعد ہوئی تھی۔ (۱۰)

معترض کو غلط فہمی (الاعراف:۱۵۰) آیت کے شروع کے الفاظ ''**ولـمـا رجع**'' سے ہوئی ہے۔یعنی جب موسیٰ اپنی قوم کی طرف لوٹے ''**ولـما سقط فی ایدیھم**'' کا ذکر چونکہ پہلے ہوا ہے اور ''**ولـما رجع موسیٰ**'' کا ذکر بعد میں ہوا ہے تو مصنف نے یہاں پر یہ سمجھا کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ ؑ کی آمد سے قبل معافی مانگ چکے تھے حالانکہ قرآن پاک کا یہ اسلوب ہے کہ وہ واقعات کی تقدیم و تاخیر کا اعتبار کئے بغیر نتائج اور عبرتوں کو درمیان میں لے آتا ہے۔تمام مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ ؑ کے واپس آ جانے کے بعد توبہ کی تھی۔(۱۱)

اور مزید یہ کہ قرآن میں اس طرح سے کہیں نہیں لکھا ہوا کہ حضرت موسیٰ ؑ کی آمد سے قبل بنی اسرائیل معافی مانگ چکے تھے کیونکہ اگر بنی اسرائیل حضرت موسیٰ ؑ کی آمد سے توبہ کر چکے ہوتے تو حضرت موسیٰ ؑ اس طرح غصے میں نہ آتے کہ آسمان سے لائی ہوئی الواح بھی پھینک دیں اور اپنے بھائی پر بھی سختی کرنے لگ جائیں۔

لہذا ندامت و استغفار کا واقعہ حضرت موسیٰ ؑ کی واپسی کے بعد کا ہے۔گویا آیت ۱۴۸ اور آیت ۱۵۰ کے مابین آیت ۱۴۹ بطور جملہ معترضہ کے ہے جو قرآن مجید کے عام اسلوب بلاغت کے مطابق ہے جیسا کہ سورۃ بقرۃ کی

آیت نمبر۴۰ میں بنی اسرائیل سے خطاب ہو رہا ہے اس آیت کے بعد کسی اور چیز کا ذکر اگلی چھ آیات میں کر دیا جاتا ہے اور اس کے بعد میں آیت نمبر ۱۴۷ سے دوبارہ بنی اسرائیل سے خطاب شروع کر دیا جاتا ہے۔

اعتراض نمبر 2:

حضرت یونسؑ کو ساحل سمندر پر پھینکا گیا یا نہیں؟

معترض کا اعتراض یہ ہے کہ سورۃ الصٰفٰت آیت نمبر ۱۴۵ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

فنبذنٰہ بالعراء و ھو سقیم

''پس ہم نے اسے میدان میں ڈال دیا اور وہ اس وقت بیمار تھا''

جبکہ سورۃ القلم آیت نمبر ۴۹ میں فرمایا گیا ہے کہ:

لولا ان تدرکہ نعمتہ من ربہ لِنبذ بالعراءِ وھو مذموم

''اگر اسے رب کا احسان نہ پا لیتا تو یقیناً وہ برے حالوں میں بنجر زمین پر ڈال دیا جاتا''۔

انگریزی قرآنی ترجمہ کے مطابق: (۱۲)

But we cast him upon the wilderness, and he was sick and was caused to grow over him a tree of gourd (37:145)

Had there not ever taken him a blessing from his Lord, he would have been cast upon the wilderness being condemned (68:49).

درج بالا دونوں آیات میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے کیونکہ سورۃ الصٰفٰت میں بتایا گیا ہے کہ حضرت یونسؑ کو کمزور حالت میں زمین پر ڈال دیا گیا جبکہ سورۃ القلم میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت جو اُن پر نازل کی اُس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اگر ہماری اُس (یونسؑ) پر نعمت نہ ہوتی تو اسے قابل مذمت حالت میں زمین پر ڈالا جاتا۔

معترض نے سورۃ القلم ۴۹:۶۸ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یونسؑ کو ریتلے ساحل پر نہیں ڈالا گیا کیونکہ خدائی رحمت نے اسے گھیرے میں لے لیا تھا حالانکہ یہ جملہ not to have been cast off desert Shore نہ تو قرآنی آیت ۴۹:۶۸ میں ہے اور نہ ہی کسی مترجم نے اس آیت کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ حضرت یونسؑ کو زمین پر ڈالا گیا تھا۔ دراصل معترض سقیم (Sick) اور مذموم (condemned) کے الفاظ میں فرق نہیں کر پایا کہ اول کا تعلق جسمانی حالت سے ہے اور دوسرے کا تعلق کردار سے ہے تو حضرت یونس علیہ السلام زمین پر کمزور جسمانی حالت میں

تو ڈالے گئے جبکہ اللہ کے فضل واحسان سے قابل مذمت حالت میں نہیں ڈالے گئے۔

اس سوال کے جائزہ کے لئے حضرت یونسؑ کے واقعہ کی تفصیل دی جاتی ہے۔

حضرت یونسؑ کو نینوا کے علاقہ موصل میں جہاں ایک لاکھ یا اس سے کچھ زیادہ لوگ آباد تھے، کی ہدایت کے لئے بھیجا۔ جب اُن کی قوم نے ان کا کہا نہیں مانا تو حضرت یونسؑ نے بستی کے مکینوں کو اطلاع دی کہ تین روز میں صبح کے وقت تم پر عذاب آئے گا۔

اب ہوا یہ کہ ادھر حضرت یونسؑ بدعا کر کے اہل نینوی سے جدا ہوئے اور اُدھر انہوں (قوم) نے بددعا کے کچھ آثار محسوس کئے۔ نیز حضرت یونسؑ کے بستی چھوڑ دینے پر یقین آ گیا کہ وہ ضرور خدا کے سچے پیغمبر ہیں۔ اور اب ہلاکت یقینی ہے تبھی حضرت یونسؑ ہم سے جدا ہو گئے ہیں۔ یہ سوچ کر فوراً بادشاہ سے لے کر رعایا تک سب کے دل خوف ودہشت سے کانپ اٹھے اور حضرت یونسؑ کو تلاش کرنے لگے تا کہ اُن کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کریں اور ساتھی سب خدائے بزرگ وبرتر کے درگاہ میں توبہ واستغفار کرنے لگے حتیٰ کہ چوپاؤں کو بھی اپنے ساتھ لے آئے اور بچوں کو ماؤں سے جدا کر دیا اور اس طرح دینوی علائق سے کٹ کر درگاہ الٰہی میں گریہ وزاری کرتے رہے۔

آخر کار اللہ تعالیٰ نے اُن کی توبہ قبول فرمائی، اُن کو دولت ایمان سے نوازا اور اُن کو عذاب سے محفوظ کر دیا جیسا کہ قرآن پاک کی سورۃ یونس آیت نمبر ۹۸ میں ارشاد ہوا ہے:۔

فلولا کانت قریۃ اٰمنت فنفعھاایمانھا الا قوم یونس لما اٰمنوا کشفنا

عنھم عذاب الخزی فی الحیٰوۃ الدنیا و متعنٰھم الٰی حین

ادھر حضرت یونسؑ قوم سے الگ ہو کر سمندر پر پہنچ گئے وہاں کشتی پر لوگ سوار ہو رہے تھے۔ حضرت یونسؑ کو وہ لوگ پہچانتے تھے آپ کو دیکھ کر انہوں نے آپ کو بے کرایہ سوار کر لیا لیکن کشتی سمندر میں پہنچ کر کھڑی ہو گئی نہ آگے بڑھتی تھی نہ پیچھے ہٹتی تھی۔ لوگوں نے کہا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشتی میں کوئی غلام اپنے آقا سے بھاگا ہوا ہے۔ جب تک اُس کو کشتی سے جدا نہ کیا جائے گا تو نجات مشکل ہے۔ تو آپ (حضرت یونسؑ) کو جذبہ خود احتسابی کے تحت یہ خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ کو میرا نینوا سے وحی کا انتظار کئے بغیر اس طرح چلا آنا پسند نہیں آیا اور میری آزمائش کے آثار ہیں یہ سوچ کر انہوں نے اہل کشتی سے فرمایا کہ وہ غلام میں ہوں لہٰذا مجھے سمندر میں پھینک دو۔ لوگ کہنے لگے ہم خود آپ پر قربان ہو جائیں گے لیکن آپ کو نہیں پھینکیں گے۔ بالآخر تین مرتبہ قرعہ ڈالا اور حضرت یونسؑ کا نام نکلا۔ کشتی کے قریب مچھلی منہ کھولے حکمِ ربیّ کی منتظر تھی۔ حضرت یونسؑ نے فرمایا خدا کی قسم تم سب لوگ ہلاک ہو

جاؤ گے ورنہ مجھے پھینک دو۔ مچھلی نے آپ کو فوراً نگل لیا اور لوگ کشتی لے کر چل دیئے۔ آپ مچھلی کے پیٹ میں "**لا اله الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین**" (الانبیا:۸۷) پڑھتے رہے۔ مچھلی کے پیٹ کے اندر آپ چالیس رات رہے اس کے بعد مچھلی نے اللہ کے حکم سے آپ کو زمین پر ڈال دیا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنا کرم دکھاتے ہوئے آپ پر سایہ کرنے کے لئے کدو کی ایک بیل اگا دی جس نے آپ کو گرمی سے بچائے رکھا اور مکھیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے آپ کے بدن کو پتوں سے چھپا لیا اور ایک جنگلی بکری کو مقرر کر دیا جو صبح شام آپ کے پاس آتی تھی اور آپ اس کا دودھ پی لیا کرتے تھے یہاں تک کہ جسم مبارک کی کھال مضبوط ہوگئی اور جسم میں توانائی آ گئی۔ (۱۳)

بعد ازاں آپ (یونسؑ) ۳۱ برس تک اپنی قوم میں موجود رہے۔ (۱۴)

اب سورۃ القلم آیت نمبر ۴۹ میں درج بالا نعمتوں کا ذکر ہے کہ:۔

لولا ان تدرکهٗ نعمته من ربه لنبذ بالعراء و هو مذموم

''اگر اسے رب کا احسان نہ پا لیتا تو یقیناً وہ برے حال میں بنجر زمین پر ڈال دیا جاتا''۔

''**نعمة**'' سے مراد یہاں اللہ کا وہ فضل ہے جو توبہ کے بعد ان کو قبولیت توبہ اور از سر نو فریضہ رسالت پر ماموریت کی شکل میں حاصل ہوا یعنی ان پر اللہ تعالیٰ کا یہ فضل نہ ہوا ہوتا تو جس ریت پر مچھلی نے ان کو ڈالا تھا اس ریت پر نہایت ہی مذموم حالت میں وہ پڑے رہ جاتے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔ (۱۵)

فاستجبنا له و نجینٰه من الغم و کذٰلك ننجی المومنین (انبیاء:۸۸)

اور ان کو اپنی رحمت سے نوازا ان کو ان کے مقدس مشن کی تکمیل کے لئے از سر نو برگزیدہ کیا اور زمرہ صالحین میں شامل فرمایا یعنی وہ اس دنیا سے ناکام و نامراد نہیں گئے بلکہ صالحین کے زمرے میں شامل ہوئے۔

اگر سورۃ القلم کی آیت ۴۹ کو سورۃ الصٰفٰت کی آیات ۱۴۲ تا ۱۴۶ کے ساتھ

فالتقمٰه الحوت و هو ملیم o فلولا انه کان من المسبحین o للبث فی بطنه الٰی یوم یبعثون o فنبذنٰه بالعراء و هو سقیم o وانبتنا علیه شجرة من یقطین o

''پس اسے مچھلی نگل گئی اور وہ ملامت کیا گیا تھا۔ پس اگر یقیناً وہ تسبیح کرنے

والوں میں سے نہ ہوتا تو وہ ضرور اس کے پیٹ میں جی اٹھنے کے دن تک پڑا
رہتا۔ پھر ہم نے اسے چٹیل زمین میں ڈال دیا اور وہ دکھی (بیمار) تھا اور ہم نے
اس پر کدو کا درخت اگا دیا''۔

ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت حضرت یونسؑ مچھلی کے پیٹ میں ڈالے گئے اس وقت تو وہ ملامت میں مبتلا تھے لیکن جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی تسبیح کی اور اپنے قصور کا اعتراف کر لیا تو اگرچہ وہ مچھلی کے پیٹ سے نکال کر بڑی سقیم حالت میں ایک چٹیل زمین پر پھینکے گئے مگر اس وقت وہ ندامت میں مبتلا نہ تھے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ ایک پودا اگا دیا تا کہ اس کے پتے اُن پر سایہ بھی کر دیں اور اس کے پھل سے بھوک اور تشنگی بھی دور کر سکیں۔ (۱۶)

علامہ قرطبی نے تفسیر میں لکھا ہے: چنانچہ

ای لنبذ مذموماً ولکنه نبذ سقیماً غیر مذموم (۱۷)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یونسؑ کو بنجر زمین پر ڈالا گیا تھا تو وہ ناتواں تھے لیکن قبولیت توبہ کی وجہ سے بری حالت اور ملامت سے محفوظ رہے بلکہ ان کا سقم اور ناتوانی دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کا اہتمام فرمایا۔

اعتراض نمبر 3:

معترض کے مطابق قرآن پاک میں ایسی بہت سی آیات ہیں جن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ انجیل حضرت عیسیٰؑ کو دی گئی جو کہ حضرت موسیٰؑ کے تقریباً چودہ سو سال بعد پیدا ہوئے لیکن قرآن پاک کی سورۃ الاعراف کی آیات ۱۵۵ تا ۱۵۷ میں حضرت موسیٰؑ جب اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کا حضرت موسیٰؑ کو جو جواب ہوتا ہے (اُس کے لئے مصنف نے آیت نمبر ۱۵۷ لکھی ہے لیکن ہم یہاں پر آیت ۱۵۵ تا ۱۵۷) مکمل طور پر تحریر کریں گے تا کہ سوال کی نوعیت اچھی طرح سمجھ آ سکے:۔

واختار موسیٰ قومهٗ سبعین رجلا لمیقاتنا فلما اخذتهم
الرجفة قال رب لو شئت اهلکتهم من قبل وایای أتُهلکنا
بما فعل السفهاء منا ان هی الا فتنتك تضل بها من تشاء
وتهدی من تشا انت و لینا فاغفرلنا و ارحمنا و انت خیر

الغفرين o واكتب لنا فی هذه الدنیا حسنة وفی الاخرة انا
هدنا الیك قال عذابی اصیب به من اشاء ورحمتی وسعت
کل شیءٍ فساکتبها للذین یتقون و یؤتون الزکوٰة والذین
هم بآیتنا یؤمنون o الذین یتبعون الرسول النبی الامی
الذی یجدونه مکتوباً عندهم فی التوراة والانجیل یامرهم
بالمعروف و ینهٰهم عن المنکر و یحل لهم الطیبٰت و
یحرم علیهم الخبٰئث و یضع عنهم اصرهم والاغلٰل التی
کانت علیهم فالذین اٰمنوا به وعزروه و نصروه واتبعوا
النور الذی انزل معه اولٰئك هم المفلحون o

معترض کے نزدیک مسئلہ یہ ہے کہ انجیل جو حضرت موسیٰؑ کے وقت ابھی ظاہر نہیں ہوئی تھی اور کوئی شخص اس وقت غیر موجود انجیل کو جانتا بھی نہیں تھا تو آیت ۱۵۷ میں اس طرح کیوں کہا گیا ہے:

"یجدونهٗ مکتوبا عندهم فی التوراة و الانجیل"

جواب:۔

سورۃ الاعراف کی آیت نمبر ۱۰۳ سے جن باتوں کا ذکر ہے اُن میں حضرت سیدنا موسیٰؑ کا قوم بنی اسرائیل کے جادوگروں کے ساتھ مقابلہ، ان کا ایمان لانا، حضرت موسیٰؑ کا فرعون کے ہاں سے چلے جانا، پھر واپس آ کر اپنی قوم کو فرعون کی غلامی کی زنجیروں سے چھڑا لے جانا، موسیٰؑ کا اپنے رب کے وعدے کے مطابق کوہ طور پر جانا، وہاں دیدارِ الٰہی کے لئے سوال جواب کا ہونا، تورات کی الواح کا دیا جانا اور ان کی غیر موجودگی میں بنی اسرائیل کا بچھڑے کی پوجا شروع کرنا، واپس آ کر موسیٰؑ کا اپنی قوم پر ناراض ہونا وغیرہ وغیرہ۔

یہ سارے واقعات ایک تسلسل کے ساتھ چلتے چلتے جب آیت ۱۵۶ تک پہنچتے ہیں تو وہیں ہمیں حضرت موسیٰؑ کی بارگاہ الٰہی میں ایک دعا ملتی ہے۔ اگر ہم آیت نمبر ۱۵۶ کے تین حصے کریں تو پہلا حصہ اس دعا کا اختتام ہے جو آیت ۱۵۵ میں شروع ہوئی تھی دوسرے حصے میں اللہ تعالیٰ قبولیت دعاء کا اعلان کرتے ہوئے اپنے عذاب و وسیع رحمت کا ذکر فرماتے ہیں اور یہیں سے موسیٰؑ کی دعاؤں کا جواب شروع ہوتا ہے۔ اور آیت نمبر ۱۵۶ کے تیسرے حصے سے لے کر آیت نمبر ۱۵۷ کے اختتام تک ساری عبارت میں بنی اسرائیل کو النبی الامّی کی آمد کی بشارت دی گئی

ہے اور آپ کی صفات کا بیان ہے اور انہیں یہ بتایا گیا ہے کہ النبی الامّی کا ذکر تمہاری کتاب تورات میں بھی اور انجیل میں بھی ہوگا۔ معترض کے نزدیک انجیل جو حضرت عیسیٰ ؑ کو ملے گی اس میں النبی الامّی کے متعلق امور کا ذکر ایک ہزار سال سے بھی زیادہ پہلے کرنا کیسے ممکن ہے اور جو کتاب ابھی اتری ہی نہیں اس میں بنی اسرائیل کے وہ لوگ جو حضرت موسیٰ ؑ کے وقت میں موجود تھے کیسے النبی الامّی کا ذکر پا سکتے ہیں؟

اور پھر تورات تو ان کے دینی امور کی مکمل کتاب تھی انہیں انجیل کی کیا ضرورت ہے۔ اور یہ کہ النبی الامّی کے ذکر کا ان کتب میں پایا جانا ان کو کیا فائدہ دے گا؟

اگر تو یہی باتیں معترض کے ذہن میں موجود مشکلات ہیں تو ان کا جواب درج ذیل ہے۔

حضرت علامہ محمود آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں:

وذکر الانجیل قبل نزوله من ما نحنُ فیه من ذکر النبی ﷺ والقرآن الکریم قبل مجیئهما (۱۸)

''اور انجیل کا اس کے نزول سے پہلے ذکر کرنا ایسے ہی ہے جیسا کہ حضور ﷺ اور قرآن کریم کا ان کی تشریف سے پہلے ذکر کیا گیا ہے''۔

نیز اسلامی تعلیمات کے مطابق نبی تو ہوتا ہی وہ ہے جو اللہ کی طرف سے عطا کردہ غیب کی خبریں دے اور لوگوں کی موجودہ صورتحال کے ساتھ ساتھ آئندہ آنے والے امور اور واقعات کی بروقت خبر دے کیونکہ وہ مامور من اللہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات کو اللہ تعالیٰ سے وصول کر کے رہبری، رہنمائی وہدایات کے متلاشی لوگوں تک منتقل کرتا ہے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ ؑ کو ایک ہزار سال پہلے بتا دیا کہ وہ انجیل نازل فرمائے گا جس میں النبی الامّی ﷺ کی صفات کا تذکرہ ہوگا تو اس میں ایسی کوئی الجھن نہیں۔

اگر الجھن اس بات پر ہو رہی ہے کہ ''یجدونه'' کا لفظ کہہ رہا ہے کہ موسیٰ ؑ کے وقت میں موجود بنی اسرائیل اس کا ذکر ایک ہزار سال قبل سن رہے ہیں تو پھر کونسی نئی مشکل درپیش ہوگی انہیں بھی قبل از نزول انجیل کی وہ باتیں بتائی جا رہی ہیں۔ ایک یہ کہ النبی الامّی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر اس وقت کے اسرائیلی تورات میں پائیں گے اور چونکہ یہ لوگ حضرت موسیٰ ؑ کے بعد تورات میں تحریفات کر دیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی اصلاح کے لئے پھر حضرت عیسیٰ ؑ بھیجے گا اور ان پر انجیل نازل فرمائے گا کیونکہ وہ بھی بنی اسرائیل میں آئیں گے تو اس وقت کے اسرائیلی النبی الامّی ﷺ کا ذکر بچی کھچی تورات اور انجیل میں بھی پائیں گے۔

چونکہ یجد ونہ کا صیغہ مضارع کا صیغہ ہے جو استمرار اور دوام پر دلالت کرتا ہے اور اس میں حال اور مستقبل دونوں کا مفہوم لیا جا سکتا ہے تورات کے لئے دونوں ''معنیٰ'' (اسے پاتے ہیں اور پائیں گے) لئے جا سکتے ہیں۔ کہ موجودہ اسرائیلی النبی الامّی کا ذکر تورات میں پاتے ہیں اور حضرت عیسیٰؑ کے وقت کے اسرائیلی النبی الامّی کا تذکرہ تورات اور انجیل دونوں میں پائیں گے۔

مذکورہ اعتراضات کے جائزہ سے یہ امر بڑی وضاحت کے ساتھ سامنے آتا ہے کہ معترضین قرآنی اسلوب سے ناواقفیت سے سبب اس غلط فہمی کے شکار ہوئے ہیں کہ قرآنی بیانات میں تضاد ہے جبکہ قرآنی مضامین میں گہرے تدبر اور قرآنی اسلوب بیان سے حقیقی واقفیت سے ہی حقائق تک رسائی ہوتی ہے۔

Conclusion No 1:

According to above mentioned Quranic passage, we come to know that Moses asked for forgiveness from Allah for Aaron. Therefore, it became clear that Aaron did not pray for forgiveness for himself. If Aaron himself had asked for forgiveness, then this would have been a case of contradiction. One can rightly claim that Aaron committed no mistake. Thus he did not share in Israelities guilt. This is obvious from the passage. Moses merely questioned Aaron that if Israelities had started worshipping the calf, he would have left them and followed him. The question is whether, it was possible to do so at that time? The answer is in negative. How was it possible to leave the people without the leader? When Aaron saw Israelies are worshipping the calf, he admonished them. But when they continued to do so and tried to kill him, he abstained and waited for his brother.

Randy was right to state that Aaron is only a guilty of not wanting to split up the children of Israel. Aaron (in the old Testament story) ordered to bring the gold for making a molten calf, fashioned with a gravity tools, and built an alter before the calf (Exod. xxxii.2-5). The Holy Bible, P-78). Our version differs than that of the old Testament. We can not believe that Aaron, who was appointed by Allah to assist Moses as Allah's Messenger could descend so low as to reduce the people into idolatry, whatever his human weaknesses might be.

(ii) This is also questioned that whether the people repented before Moses came back to them or otherwise. Moses was furious enough when he came to know that the people worshipped the calf after he had left them behind. It was

natural for Moses that he showed his anger to the Israelites. This itself shows that at the arrival of Moses, people were still worshipping the calf. It is also to note that the Quran never stated that people have repented before Moses came to them. One should be clear that in each case only those points are referred to, which are necessary to the argument in hand. Randy Desmond has also stated that the words **"Wa Lamma"** mean at the time of and not denoting the sequence in time. On the basis of this discussion we can safely conclude that there is no conflict between 7:149 and 20:91.

Conclusion No 2:

There is no contradiction in sura (37:145) and (68:49). The well known Muslim translators have rendered these verses differing in style and in some minor points. For example, Pickthall translated the verse "(37:145)", "Then we cast him on a desert shore while he was sick". He translated the other verse (68:49), "Had it not been that favour from his Lord reached him, he surely would have been cast into the wilderness while he was reprobate (madhmoomun).

When we read both the verses altogether, we are able to draw the conclusion, that Jonah was cast on the desert shore and was saved from the misery. This was award of his repentance. God accepted his repentance, pardoned him and saved him from the misery.

The entire situation reveals that the Jonah had been granted with better condition to get himself flourished ..... The growing of the gourd-tree and the milk (of goat) were the special blessings which were sent by the Gracious God. The situation of the sickness would have continued, if the divine grace had not pardoned him with such kind of above mentioned favours. Therefore, no contradiction can be claimed on this point.

ConclusionNo.3:

The contradiction may be solved by studying the drift of the verses in detail. The point lies in the applicability of the same meaning of word in present and future tense. The word **"YAJEDOONAHU"** is not confined to one era or the particular period. It applies to both eras i.e. present and future.

> The writer is not willing to accept the response of Randy Desmond, who translated it referring to future.

The writer insists that meaning of the verse refers to the present. So much so it is quite possible that the khitab of the verse is now moved from Moses to Muhammad (PBUH). The Jews and Christians of the time are addressed. It is told to them that they should follow the prophet Muhammad (PBUH) who is unlettered. He was mentioned in Torah as well as in Injil. If we take this meaning granted, then there is no contradiction at all. The author's worry is that the passage speaks about in present. The answer to this worry can be given that, this may be one of the cases of Aslub-e-Quran. For example, surah Baqarah verse 40, addresses Bani Israel. After this, some other statements are given. While verse 47, again addresses Bani Israeil. The proposed objection appears to be the same. The story of Moses is interrupted by giving information about Muhammad (PBUH). Later the story of Moses continues. Thus, the seeming contradiction claimed by the author stands nowhere.

حوالہ جات

۱۔ Lewis B, "The Roots of MuslimRage, P-49, The Antlatic, Sep (1990).

۲۔ دیاب، محمد احمد، الدکتور، اضواء علی الاستشراق والمستشرقین، ص۱۰، بحوالہ ضیاء النبی، ج۶، ص ۱۵، ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور، ۱۳۹۹ھ

۳۔ الاستشراق، رسالۃ الاستعمار، ص۱۴۲، بحوالہ ضیاء النبی، ج۶، ص ۲۰

۴۔ Said, E. W. Orientalism , Newyork:panthon Books, 1978

۵۔ الازہری، کرم شاہ پیر، ضیاء القرآن، ج۶، ص۱۲۳، ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور، ۱۴۱۸ھ

۶۔ نظامی، خلیق احمد، (مقالہ) مستشرقین کے افکار و نظریات کے مختلف ادوار، ص۱۷۔۱۱، بحوالہ ضیاء النبی، ج۶

۷۔ الازہری، کرم شاہ پیر، ضیاء القرآن، ج۶، ص۸۶

۸۔ قطب شہید، سید، فی ظلال القرآن، ج ۴، ص ۳۷، اسلامی اکادمی اردو بازار لاہور، ۱۹۸۹ء

۹۔ زمخشری، محمود بن عمر، الکشاف عن حقائق التنزیل، (مترجم معروف شاہ شیرازی)، ج ۲، ص ۱۶۲، الناشر ادارہ اکتساب العربی، بیروت، ایضاً، طبری ابن جریر، جامع البیان عن التاویل ای القرآن، ج ۶، ص ۶۹، دارالفکر، بیروت، ایضاً البروسوی، اسماعیل حقی، شیخ، روح البیان جز ۳، ص ۲۴۶، دار، احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۸۵

۱۰۔ الرازی، فخر الدین، مفاتیح الغیب، ج ۱۵، ص ۹، دارلفکر بیروت، ۱۹۹۳ء

۱۱۔ الشوکانی، محمد بن علی، فتح القدیر، ج ۲، ص ۲۴۸، الجامع الغنی بین الروایۃ والدرایۃ، دارلمعرفۃ، بیروت، ۱۹۹۷ء

۱۲۔ دریا آبادی، عبدالماجد، تفسیر ماجدی، ص ۳۵۸، تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور

۱۳۔ Arberry, J. Arthur, The Koran interpreted, P-461, 601, Oxford University Press Melbourne, Newyork, 1979.

۱۴۔ ابن کثیر، ابوالفداء، تفسیر القرآن العظیم، ج ۴، ص ۲۲، دارالمنار بیروت

۱۵۔ قصص القران، ج ۲، ص ۱۹۷ دارالاشاعت، بالمقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی

۱۶۔ اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، ج ۷، ص ۵۳۱، فاران فاؤنڈیشن لاہور، ۱۹۸۲ء

۱۷۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ج ۶، ص ۶۸، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور

۱۸۔ قرطبی، ابی عبداللہ محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، ج ۱۸، ص ۲۵۴، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۸۹ء

۱۹۔ آلوسی، علامہ محمود آفندی، روح المعانی، ج ۹، ص ۲۵، داراحیاء التراث العربی، بیروت لبنان، س۔ن، ایضاً ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ج ۲، ص ۲۵۲، ایضاً حقانی، عبدالحق، فتح المنان، ج ۲، ص ۴۲۷، میر محمد کتب خانہ آرام باغ، کراچی